ڈاکٹر سید رفیع الدین اشفاق:

پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب

زندگی کتنی طویل ہے اور پھر بھی کتنی مختصر!

زندگی کے ایام یکے بعد دیگرے گزرتے گئے اور اس عاجز کی عمر کے ۷۳ سال بلکہ اس سے بھی زیادہ پورے ہوگئے۔ مگر محسوس یہی ہوتا ہے کہ ہم دنیا میں کچھ بھی نہیں رہے — ایک دن یا اس بھی سے کم، یوماً او بعضَ یوم — وہی لیل و نہار ہیں اور وہی صبح و شام — خدا جانے اب اور کتنا وقت باقی ہے۔

مجھے یاد ہے کہ آج سے تقریباً ۵۷ سال پہلے میں پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب سے علی گڑھ میں ملا تھا۔ میں ایک نو وارد تھا اور ڈاکٹر صاحب وہاں کے سینیر۔۱ (Senior) طلبہ میں شمار ہو رہے تھے۔ بہرحال یہ رشتہ علی گڑھ برادری سے شروع ہوا اور وقت کے ساتھ ایسا بڑھا کہ وہ میرے لیے بھائیوں سے زیادہ بھائی، دوستوں سے زیادہ دوست اور بزرگوں سے زیادہ بزرگ ہوگئے۔ میری زندگی کی کوئی خوشی اور کوئی غم ایسا نہیں ہے جس میں ڈاکٹر صاحب میرے شریک حال نہ رہے ہوں۔ اگرچہ کم و بیش ۴۳ سال سے ہمارے درمیان ایک آہنی دیوار حائل ہے۔ ڈاکٹر

۱۔ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ میں سینیر اور جونیر خاص مفہوم رکھتے تھے جن کے لیے اردو کا بدل مجھے نہ مل سکا۔

صاحب کی بزرگانہ شفقت اور خلوص و محبت کو میں انعاماتِ الٰہی میں ایک عظیم انعام سمجھتا ہوں اور توشۂ آخرت جانتا ہوں۔

مدت ہوئی کہ ہمارا مسلم یونیورسٹی کا دور گزر گیا مگر اس زندگی کی یاد اور ان صحبتوں کے نقشے نظروں میں ہیں۔ مجھے یاد ہے کہ علی گڑھ کی زندگی میں وہاں کی تعلیمی سہولتوں کا جو فائدہ ڈاکٹر صاحب نے اٹھایا اور جس انہماک سے اپنی صلاحیت کو بڑھایا وہ وہاں کے طلبہ میں کم کو نصیب ہوا۔ عربی، فارسی، اردو اور قانون کے علاوہ آپ نے فن تجوید کی طرف خاص توجہ فرمائی اور مولانا قاری ضیاء الدین رح کے سامنے زانوئے ادب تہ کرکے اس فن کی تکمیل فرمائی۔ اس کے علاوہ مولانا سید سلیمان اشرف رح اور مولانا ابوبکر شیث رح سے تعلق پیدا کرکے علوم اسلامیہ میں اپنی استعداد کو بڑھایا۔ مولانا سلیمان اشرف رح کے درس تفسیر میں برسوں شریک رہے۔ مولانا کے درس تفسیر کی مقبولیت کا یہ عالم تھا کہ یونیورسٹی کے اساتذہ بھی اس میں شریک ہوتے۔ وہاں کبھی کبھی میں نے صدر الصدور نواب حبیب الرحمٰن خاں شیروانی رح کو بھی دیکھا ہے۔ اس دور میں یونیورسٹی کے کئی شعبوں میں جلیل القدر اساتذہ موجود تھے جن پر جامعہ کو بجا طور پر ناز تھا۔

کہا گیا ہے کہ علم فقط کتابوں کے مطالعے سے حاصل نہیں ہوتا۔ اس کے لیے استاد کی صحبت بھی ضروری ہے، اس لیے کہ طالب علم اس طرح ان نادر اور لطیف نکتوں سے بہرہ مند ہو سکتا ہے جس کا بدل اس کی ساری عمر کا مطالعہ نہیں ہو سکتا۔ ڈاکٹر صاحب کے اخلاق کا یہ نمایاں پہلو ہے کہ آپ نے نہ صرف اپنے اساتذہ کے ساتھ گہرا تعلق رکھا بلکہ ان کے بعد یہ تعلق ان کی اولاد کے ساتھ بھی قائم رکھا۔

تعلیم سے فارغ ہونے کے بعد ڈاکٹر صاحب کو مقدر نے برار کے مشہور و معروف کنگ ایڈورڈ کالج امراؤتی میں بحیثیت لکچرر پہنچا دیا ۔ امراؤتی پہنچ کر آپ نے اپنے طلبہ کی تعلیم و تربیت میں جو دلچسپی لی اس کی توقع ایک علیگ ہی سے کی جا سکتی تھی جس میں قابلیت کے علاوہ قومی اور دینی احساس کے ساتھ قربانی کا جذبہ موجود ہو۔

میں نے اپنی تعلیم کی تکمیل کے بعد چند سال حیدرآباد دکن میں گزارے ۔ آخر مقدر نے اس ناچیز کو بھی عربی اور اردو کے لکچرر کی حیثیت سے مارس کالج ناگپور پہنچا دیا اور میں ۱۰ اکتوبر ۱۹۷۳ء کو رجوع خدمت بھی ہوگیا۔ اس طرح ڈاکٹر صاحب کی رفاقت سے محرومی کی تلافی بھی ہو گئی۔ آپ اس وقت ناگ پور یونی ورسٹی میں شعبۂ اردو کے صدر تھے، اور اپنے علم و فضل کے لیے یونی ورسٹی میں شہرت رکھتے تھے ۔ آپ کے مضامین ناگ پور یونی ورسٹی جرنل میں اکثر شائع ہوتے ۔ اس کے علاوہ ہندوستان کے دیگر رسالوں میں بھی آپ کے مضامین کی اشاعت کا سلسلہ جاری تھا ۔

ڈاکٹر صاحب کے مشاغل کثیر تھے، علمی بھی اور مخلوق کی خدمت سے متعلق بھی۔ تعطیلات میں دور دور کا سفر اختیار کرتے اور ہندوستان کے مشہور کتب خانوں اور فاضلوں کی محبت سے استفادہ فرماتے اور اپنے تحقیقی کام کے لیے مواد مہیا کرتے ۔ ڈاکٹر صاحب کے لکچر کی تیاری میں بھی تحقیق کا انداز تھا ۔ الفاظ اور محاورات کی تحقیق اور متن کی تصحیح کو وہ مقدم سمجھتے اور اس کا فائدہ وہ اپنے شریک کار احباب کو بھی پہنچاتے ۔ اسی لیے ہم لوگ غلط پڑھانے کے الزام سے ہمیشہ بری رہے ۔

ڈاکٹر صاحب کے زیر تعلیم و تربیت طلبہ میں زندگی کی نئی امنگ نظر آنے لگی۔ یہ آپ کی نگاہ کا کرشمہ تھا کہ وہ اچھے انسان اور اچھے طالبعلم بننے کے لیے تیار ہو گئے۔ ڈاکٹر صاحب اپنے طلبہ کے لیے نہ صرف ایک شفیق معلم تھے، وہ ان کے مربی اور سرپرست بھی تھے جو دامے درمے قدمے سخنے ہر طرح ان کی مدد فرماتے۔ اس لیے آج بھی ان کے فدائیوں کی ایک کثیر جماعت دیدہ و دل فرش راہ کیے ہوئے ہے۔ ایسے استاد، ایسے شاگرد اور ایسی محبت اب کہاں۔

ڈاکٹر صاحب اپنے شاگردوں کو وعظ و نصیحت کرتے بہت کم پائے گئے۔ یہ دیکھکر مجھے رشک پیدا ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کے شاگرد بغیر وعظ و نصیحت کے اتنے اچھے ہیں جبکہ میرے واعظانہ انداز کا ان پر کوئی اثر نہیں۔ ایک روز میں نے آپ سے اس کا سبب دریافت کیا۔ کچھ سوچ کر فرمایا " یہ اس سرزمین کا اثر ہے جہاں میں ہوں، ناگپور کی سرزمین میں وہ بات نہیں" مجھے ہنسی آئی مگر ڈاکٹر صاحب مسکرائے تک نہیں۔ تواضع کی یہ شکل کرامت سے کم نہیں۔

ڈاکٹر صاحب کا ایک فیض عام جاری تھا جس میں مستحق اور غیر مستحق کا زیادہ امتیاز نہیں تھا، گویا ان کی نظر میں وہ شان ربوبیت بسی ہوئی تھی جو اس دنیا کی زندگی میں انعام و اکرام کے لیے مومن اور کافر، عالم اور جاہل، متقی اور گنہگار، اہل اور نااہل کے درمیان امتیاز نہیں برتتی۔ جو علم حاصل کرنا چاہتا اسے علم مل جاتا اور جو فقط امتحان پاس کرنا چاہتا اس کی بھی آرزو پوری ہوجاتی۔ لوگ قرض مانگتے تو ڈاکٹر صاحب تکلیف اٹھاکر ان کی ضرورت پوری کرتے۔ ایک روز میں نے دریافت کیا

"میری سمجھ میں نہیں آتا کہ یہ آپ کیوں کرتے ہیں، آپ کی تنخواہ میں اتنی گنجائش کہاں سے نکل آتی ہے؟" — سنجیدہ لہجے میں جواب دیا "بھائی اشفاق! انسان اپنی ذاتی ضرورتوں کو مختصر کر لے اور سادگی اختیار کرے تو اتنی گنجائش ضرور نکال سکتا ہے کہ دوسروں کے کام آئے۔ مالداری اور عشرت کا دارومدار انسان کی آمدنی پر اتنا نہیں جتنا اس کے خرچ کرنے کے طریقے پر"۔ جس کے ساتھ احسان کیا اس کا علم اور کسی کو نہ ہوا۔

ڈاکٹر صاحب اپنی طالب علمی کے زمانے سے علم کے لیے مشہور تھے، بات نپی تلی، کم سے کم الفاظ میں، مگر یہ بھی دیکھا گیا کہ کبھی جب افغانی رگ پھڑک جاتی تو ان کا غیظ و غضب بھی دیدنی ہوتا۔ مگر اس حالت میں بھی علم کا دامن ہاتھ سے چھوٹنے نہ پاتا، جو بھی کہتے شریفانہ انداز میں اور تہذیب کے دائرے میں رہ کر۔ ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا یہ دور آج کی زندگی سے قدرے مختلف تھا، اس معنی میں کہ آپ کا ظاہر اپنی وضع قطع میں جدید اور قدیم کا سنگم تھا۔ البتہ ان کے اعمال اور اشغال میں ولایت کے آثار ضرور نمایاں تھے۔ علم کے باوجود طبیعت میں وہی ایک علیگ کی شگفتگی، انداز میں وہی بے تکلفی اور گفتگو میں وہی ظرافت کی چاشنی۔ جب علی گڑھ کی زندگی کا ذکر چھڑ جاتا تو بالکل علی گڑھ کے طالب علم بن جاتے اور مزے لے لے کر پرانے قصے بیان کرتے۔ خود بھی ہنستے اور ساری محفل کو قہقہوں کے لیے مجبور کر دیتے۔ ڈاکٹر صاحب کے مزاج کی سنجیدہ ظرافت کا رنگ دیکھنا ہو تو آپ ان کے پرانے ساتھیوں کی مجلس میں دیکھیے۔

ایک دن غریب خانے پر دورانِ گفتگو ڈاکٹر صاحب کے بڑے صاحبزادے سراج میاں کا ذکر آ گیا۔ سراج میاں اس وقت چھوٹے

تھے۔ ڈاکٹر صاحب ان سے بے حد محبت فرماتے اور ان کا ذکر آجاتا تو باغ باغ ہوجاتے۔ سراج میاں بڑے ہوگئے، انہیں بڑے کہ ان کی تعلیم کا انتظام کرنا ضروری ہوگیا۔ معلّم کی تلاش ہوئی، وہ بھی مل گیا اور بچے کے انٹرویو کے لیے ڈاکٹر صاحب کے مکان پر حاضر بھی ہوگیا۔ بچے کی آزاد فطرت بھلا کب اس قید و بند کو آسانی سے قبول کرلیتی!— سراج میاں بڑی مشکل سے ہاتھ آئے اور جب دیکھا کہ زبردستی معلم کے روبرو پیش ہونے کا وقت آ ہی گیا تو معصومانہ انداز میں آبدیدہ ہوکر اور ڈاکٹر صاحب کی طرف دیکھکر فریاد کی "ابا! وہ تو پڑھا ہی دے گا۔"

ڈاکٹر صاحب اس قصے کو مزے لے لے کر جس انداز میں بیان فرماتے، مجلس قہقہوں سے گونج اٹھتی۔ بیٹے کی محبت کیا ہے؟ — یہ تو فقط باپ کا دل ہی جانتا ہے۔ مجھے قومی اور ملّی کاموں میں حصہ لینے کا بڑا شوق تھا۔ ڈاکٹر صاحب کو یہ بات پسند نہ تھی کہ میں اپنا علمی کام چھوڑ کر کسی اور کام میں اپنا وقت ضائع کروں۔ اکثر فرماتے "آپ جو کر رہے ہیں وہ کام تو اور لوگ بھی کرسکتے ہیں اور کر رہے ہیں، اور جو کام آپ کرسکتے ہیں وہ اور لوگ نہیں کرسکتے"۔ بہرحال آپ کے خلوص نے ساتھ نہ چھوڑا۔ انھوں نے اپنا تقاضا جاری رکھا اور بہت سے موضوعات تجویز فرمائے، آخر ایک دن دورانِ گفتگو میری طرف دیکھکر فرمایا "کیا اچھا ہو اگر آپ اردو میں نعت گوئی پر تحقیقی کام کر لیں، ہم خرما ہم ثواب"۔ موضوع ایسا تھا جس پر لکھنے سے انکار ایمان کے منافی تھا۔ میں بطیب خاطر تیار ہوگیا۔ چنانچہ ضروری کاروائی کے بعد میرا نام ناگپور یونی ورسٹی کی پی۔ ایچ ڈی ڈگری کے امیدواروں میں درج ہوگیا اور ڈاکٹر صاحب میرے نگرانِ کار مقرر

ہوئے۔ اس طرح اس عاصی کو بارگاہ نبوی صہ میں جو ہدیۂ نیاز پیش کرنے کی سعادت نصیب ہوئی، اسے محض ڈاکٹر صاحب کے حسنات میں شمار کرتا ہوں۔

اس تھوڑے سے عرصے میں یہاں رہ کر ڈاکٹر صاحب نے جو تحقیقی کام سرانجام دیئے، وہ تحقیقی نقطۂ نظر سے نہایت بلند پایہ ہیں اور ان پر ناگپور یونی ورسٹی کو بجا طور پر فخر ہے۔ دراصل تحقیق کے اصول اور ضوابط پڑھکر کوئی محقق نہیں بن جاتا بلکہ ایک محقق تحقیقی مزاج لیکر آتا ہے جو ان اصول کی طرف اسکی رہنمائی کرتا ہے یعنی جو طریقۂ کار وہ اختیار کرتا ہے وہی تحقیق کے اصول بھی بن جاتے ہیں۔ ڈاکٹر صاحب کے دور میں جامعاتی سطح پر ابھی تحقیقی کام کی ابتدا تھی۔ بہت کم لوگ اس طرف رجوع تھے۔ ڈاکٹر صاحب نے جو اصول اپنے تحقیقی کام کے لیے اپنائے وہ ان کے مزاج کا ایک فطری بہاؤ تھا جو تحقیقی کام کے اصولوں سے مختلف نہیں تھا۔ پھر بھی ڈاکٹر صاحب کا انداز ایک لحاظ سے سب سے نہیں تو اکثر سے جدا ہے جو ان کے مزاج کا آئینہ دار ہے۔

محقق کا کام یہ ہے کہ کھرے اور کھوٹے کو الگ کر دکھائے اور غلط فہمی یا غلط بیانی کا رد پیش کرے۔ ڈاکٹر صاحب نے یہ کام جس خوش اسلوبی سے انجام دیا وہ ہر محقق کے لیے مشعل راہ کی حیثیت رکھتا ہے۔ وہ کسی کے رد میں لکھتے بھی ہیں تو محض اس نیت سے کہ غلطی کی اصلاح ہوجائے نہ یہ کہ اپنی علمی برتری اس طرح دکھائیں کہ کسی کی عظمت پر حرف آجائے۔ پھر یہ نفسی اور شرافتِ نفس کا یہ عالم ہے کہ کسی فاضل کے رد میں لکھتے بھی ہیں تو اس کا نام ظاہر کرنا

پسند نہیں فرمائے حالانکہ اکثر محققین کا دستور اس کے برعکس ہے۔ کم لوگ ایسے ملیں گے جن کی تحریر، تقریر، تنقید، تحقیق حتیٰ کہ نشست و برخاست میں اور شخصیت میں اس درجہ یک رنگی اور توازن دیکھا گیا۔

میں اکثر غور کرتا ہوں کہ ڈاکٹر صاحب نے اس قدر قلیل وقت میں اتنا بہت سا کام کیونکر کرلیا تو میں اس نتیجے پر پہنچتا ہوں کہ اس کی وجہ صرف یہ ہے کہ انھوں نے اپنے اوقات کا بڑا خیال رکھا۔ وقت اللہ تعالیٰ کی بڑی نعمت اور اسکی امانت ہے۔ کسی کے مرتبے کو پہچاننے کے لیے ضروری ہے کہ دیکھا جائے کہ وہ اس امانت کو کس طرح برت رہا ہے۔ اس کی زندگی کے اوقات کن معمولات سے آباد ہیں۔ اسکی سماعت، اس کی بصارت، اس کی قوت حافظہ اور دل و دماغ کا استعمال کس طور پر ہو رہا ہے۔ جس نے وقت کی قدر جانی وہی زندگی میں کامیاب ہوا اور اپنے رب کے سامنے سرخرو ہوا۔

ڈاکٹر صاحب نے اپنی زندگی کا کوئی لمحہ ضائع نہیں ہونے دیا۔ کالج کی تدریسی خدمت اور خدمت خلق کے علاوہ آپ نے اپنے اوقات کو علمی ادبی اور تحقیقی کاموں کے لیے اس طرح منظم کیا کہ تھوڑے ہی عرصے میں آپ کی قابلیت کہاں سے کہاں پہنچ گئی اور آپ کی تصانیف اور تحقیقی مقالے تیزی سے منظر عام پر آنے لگے۔ اللہ تعالیٰ نے آپ کے اوقات میں ایسی برکت عطا فرمائی کہ ان ادبی اور علمی کاموں کے ساتھ درس قرآن کا سلسلہ بھی جاری فرمادیا اور قرآن سے جو فطری مناسبت ڈاکٹر صاحب کو شروع سے رہی اس کے جوہر پاکستان جاکر کھلے جو کئی شکلوں میں جلوہ گر ہوئے۔

اب وہ وقت بھی آ گیا کہ دوسری جنگ عظیم ختم ہوئی اور انگریزوں نے خیر اسی میں جانی کہ ہندوستان کو آزاد کردیا جائے۔ مگر فرقہ وارانہ ذہنیت کا جو بیج انگریزوں نے اپنی سیاسی پالیسی کے تحت بویا تھا وہ اب تناور درخت بن چکا تھا، لہذا اس آزادی کے مسئلے نے نئے نئے مسائل پیدا کردیے۔ اب سوال یہ پیدا ہوا کہ یہ دو قومیں ہندو اور مسلمان ساتھ کیونکر رہ سکیں گے۔ سیاسی افق پر بڑی ہنگامہ آرائیاں ہوئیں اور جیسے جیسے آزادی کا وقت قریب آتا گیا، فرقہ وارانہ جذبات کا اُبال بڑھتا ہی گیا: جس نے جگہ جگہ فرقہ وارانہ فساد کی شکل اختیار کرلی۔ آخر خدا خدا کر کے ملک ۱۴ اگست ۱۹۴۷ کو آزاد ہو گیا مگر اسکی عوام نے ایسی مصیبتیں اٹھائیں جن کے بیان سے آج بھی دل لرز جاتا ہے۔ اسی ہنگامے میں ڈاکٹر صاحب بھی کراچی پہنچ گئے۔

پاکستان کے قیام کا جو مقصد ہمیں بتایا گیا تھا وہ یہ تھا کہ وہاں کی زندگی میں اللہ کی حکومت ہوگی اور قانون قرآن کا جاری ہوگا۔ اسی جذبے اور آرزو کو لے کر لاکھوں ایمان والوں نے اپنے گھروں کو خیرباد کہا تھا اور ہزاروں صعوبتیں جھیلتے ہوئے اس دارالسلام میں پہنچے تھے جس کا نام پاکستان ہے۔ یہ آرزو اجتماعی یا انفرادی طور پر کسی کی پوری ہوئی ہو یا نہ ہوئی ہو، میں دیکھتا ہوں کہ ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کی یہ آرزو اللہ نے پوری کردی اور ان کی زندگی ایسی اللہ والی ہوگئی جو ایمان والوں میں بہت کم کو نصیب ہوتی ہے۔ پاکستان پہنچ کر موصوف کی علمی اور ادبی کاوشوں نے بھی اپنے اندر رنگارنگی پیدا کرلی۔ ہندوستان میں وہ سید حسن غزنوی، تاریخ بہرام شاہ غزنوی (انگریزی میں)، فارسی پر اردو کا اثر، علمی نقوش اور اس نوع کے دیگر ادبی کاموں میں مصروف رہے تو پاکستان پہنچ کر رسائل

مشاهیر نقشبندیہ ، ملفوظات صوفیہ ، ارشاد رحیمیہ ، ھدایت الطالبین ، تحفہ زواریہ ، وسیلۃ القبول ، تفسیر مولانا عبیداللہ سندھی ، ترجمہ قرآن پاک از مخدوم نوح (پہلا پارہ)، اثبات النبوۃ ، مکاشفات عینیہ، فضائل صحابہ رض، حضرت مجدد الف ثانی: تحقیقی جائزہ ، ضیاءالقراءت، لوائح خانقاہ مظہریہ ، مکتوبات معصومیہ ، سبیل الرشاد ، حضرات القدس ، معارف اقبال ، اقبال اور قرآن اور اسی قبیل کی کئی کتابوں کے مصنف یا مؤلف یا مترجم بن گئے ۔ موصوف کے اوقات میں اللہ نے ایسی برکت عطا کی کہ برسوں کا کام مہینوں میں کرلیا ۔ اگر ڈاکٹر صاحب کی علمی کاوشیں نہ ہوتیں تو سلسلۂ نقشبندیہ کا قیمتی علمی سرمایہ خانگی کتب خانوں میں بے التفاتی کی نذر ہو کر تلف بھی ہو جاتا ۔

ڈاکٹر صاحب ناگ پور یونیورسٹی سے تشریف لے گئے مگر اپنے قدردانوں کا ایک وسیع حلقہ چھوڑ گئے ۔ چنانچہ آپ کی ڈی ۔ لٹ کی ڈگری کے لیے متعلقہ مجلس میں تجویز پیش ہوئی تو سبھی نے اس تجویز کی تائید کی، اس لیے بھی کہ یہ ڈی ۔ لٹ کی ڈگری کا اعزاز ڈاکٹر صاحب کے لیے اتنا بڑا نہ تھا جتنا خود یونیورسٹی کے لیے جسے موصوف کے ادبی اور علمی کاموں پر بجا طور پر فخر تھا ۔ یونیورسٹی کے ارباب حل و عقد اب بھی ڈاکٹر صاحب کو اپنا ہی آدمی سمجھتے تھے حالانکہ وہ خوب جانتے تھے کہ آپ اس وقت پاکستان کے شہری ہیں ۔ سچ ہے انسان کے ذاتی مناقب کے سامنے دشمن کو بھی سپر ڈال دینا پڑتا ہے ۔

ڈاکٹر صاحب کو اللہ تعالیٰ نے بہت سے شخصی صفات حسنہ سے نوازا ہے ، جن میں درگزر، تحمل، تواضع، صادق البیانی،

بے نفسی اور رواداری ایسی صفات ہیں جو اس درجہ کم لوگوں میں پائی جاتی ہیں۔

کسی کی کوتاہی کو نظر انداز کرنے کی مثالیں بہت ملی گی مگر کوتاہی کو کوتاہی نہ سمجھنے کی مثال میں نے فقط ڈاکٹر صاحب میں پائی۔ لغزشیں دوستوں سے بھی ہوئیں اور ایذائیں دشمنوں نے خوب پہنچائیں مگر آپ پر اس کا کوئی اثر نہ پایا گیا یہاں تک کہ کبھی تو یہ بھی گماں ہوتا کہ آپ دشمن کو بھی دشمن نہیں سمجھتے۔ ایک دو لغزشیں احباب کی طرف سے ایسی بھی ہوئیں کہ خیال ہوا کہ ڈاکٹر صاحب کبھی معاف نہ کریں گے .مگر واللہ آج تک کبھی زبان پر ان کا ذکر نہ آیا، گویا کچھ ہوا ہی نہیں۔ انھوں نے کبھی یہ نہیں دیکھا کہ ان کے ساتھ کوئی کیا کرتا ہے بلکہ ہمیشہ یہی خیال رہا کہ انہیں اس کے ساتھ کیا کرنا چاہیے، کسی پر احسان کیا تو رویّے سے یہ محسوس ہوا کہ آپ ہی اس کے احسان مند ہیں کہ اس نے اس احسان کو قبول کرلیا۔ سچ ہے کہ انسان کے اعمال اس کی فطرت کی رو میں بہتے ہیں۔

ڈاکٹر صاحب کے فدائیوں میں سبھی قسم کے لوگ شامل ہیں، مذہبی، غیر مذہبی، دیوبندی، بریلوی، قادری، چشتی، نقشبندی وغیرہ وغیرہ۔ ایک روز دیوبندی اور بریلوی کا ذکر چھڑ گیا۔ میں نے دریافت کیا "ان دونوں کے بارے میں آپ کا کیا خیال ہے؟" لطیف مسکراہٹ لبوں پر دوڑ گئی اور رازدارانہ انداز میں فرمایا "میرے بھائی! اللہ تعالیٰ کی وسیع رحمت کو اس درجہ محدود کردینا ایمان کی بات نہیں ہے۔ کسی کو جنتی اور کسی کو دوزخی

بنانے کا ھمیں کیا حق پہنچتا ھے ؟ منفرت کی امید تو سبھی کے لیے رکھنی چاھیے"۔

اِس ناچیز کو اس برصغیر میں کئی نامور شخصیتوں کی خدمت میں حاضری کا شرف حاصل رہا مگر کوئی نہ کوئی بات اکثر میں ایسی پائی کہ محفل سے دل برداشتہ اٹھا ۔ تواضع اللہ تعالیٰ کا ایسا انعام ھے جو اس کے خاص بندوں ھی کو عطا ھوتا ھے ورنہ کون ھے شعوری یا غیرشعوری طور پر اپنی عظمت کا احساس نہ رکھتا ھو اور اسکی داد نہ چاھتا ھو، حالانکہ کوئی عظمت ایسی نہیں ھے جس میں اللہ کی مخلوق اپنے خالق کی شریک ھو، اور نہ کوئی نعمت ایسی ھے جس کے حصول کے لیے آسے اپنے رب کی محتاجی نہ ھو؟ — جو بھی ھے اُسی کی توفیق سے ھے اور اُسی کا انعام ھے، انسان کا اپنا کچھ نہیں — انسان کی بڑی عظمت یہی ھے کہ وہ اپنے رب کا عبد شکور بن جائے اور یہی اس کی معراج بھی ھے ۔ سبحان الذی اسری بعبدہ میں یہی نکتہ ھے ۔ کمال عبدیت کا دوسرا نام معراج ھے ۔ ایک ایمان والے کے لیے بڑا کمال یہ ھے کہ وہ صاحب معراج کا غلام بن جائے یعنی وہ غلام محمد ص، غلام رسول ص اور غلام مصطفیٰ ص بن جائے اور اگر اللہ تعالیٰ اپنے فضل کرم سے اپنے کسی بندے کو اسم بامسمّیٰ بھی بنادے تو نورٌ علی نور۔ ذالک فضل اللہ یوتیہ من یشاء ۔

ڈاکٹر صاحب نے نخوت اور غرور کو قریب پھٹکنے نہیں دیا ۔ تواضع اور خاکساری ان کے قدم چومتی ھے اور خلوص و محبت ان کے جلو میں پر بچھاتی ھے۔ وھی سادگی ، وھی عاجزانہ اور دلنوازانہ انداز گفتگو وھی نورانی تبسم جو کبھی علی گڑھ میں دیکھا تھا آج بھی وھی دیکھ رھا ھوں ۔

اپنے چھوٹوں کو آگے بڑھانا اور ان کی حوصلہ افزائی کرنا ڈاکٹر صاحب کی زندگی کا دستور رہا ہے۔ اپنی ذات پر اوروں کو مقدم رکھا۔ اکثر فرماتے "اگر ہماری تھوڑی سی قربانی سے دوسروں کا بھلا ہوجائے تو اس میں اپنا بگڑتا ہی کیا ہے؟" جو بات کہی صاف اور ستھری۔ اس میں وہ کسی کی رعایت نہیں فرماتے۔ ساری زندگی حق گوئی، بے ریائی اور بے باکی میں گذر گئی۔ دن کو دن کہا اور رات کو رات۔ آپ ڈاکٹر صاحب کی کتاب "تاریخ اسلاف" پڑھیے اور میرے اس بیان کی تصدیق کیجیے۔

ایک صاحب جو ڈاکٹر صاحب کے عقیدتمند تھے مصر ہوئے کہ میں ڈاکٹر صاحب کی کرامتیں بیان کروں۔ان کا حسن ظن،میرے بارے میں یہ تھا کہ میں موصوف کے باطنی حالات کا رازداں ہوں۔ میں نے لاکھ سمجھایا، وہ نہ مانے۔ آخر میں نے دریافت کی "کرامت سے آپ کی مراد کیا ہے؟۔ تشفی بخش جواب نہ دے سکے مگر میں ان کا عندیہ سمجھ گیا۔ میں نے کہا جو کرامتیں آپ مجھ سے معلوم کرنا چاہتے ہیں ان میں آپ مجھے معذور سمجھیں البتہ ڈاکٹر صاحب کی ایک کرامت ضرور بیان کروں گا جو میری ذات سے متعلق ہے۔ سنیے — پاکستان کے قیام سے پہلے میں ڈاکٹر صاحب کی نگرانی میں "اردو میں نعت گوئی" پر تحقیقی مقالہ لکھ رہا تھا۔ ڈاکٹر صاحب کے تشریف لے جانے کے بعد کام سست پڑگیا۔ مگر آپ کی توجہ برابر کام کرتی رہی اور تقاضا جاری رہا اور آخر اتنا شدید ہوگیا کہ مجھے ڈر ہوا بلکہ یقین ہوگیا کہ اگر میں نہ لکھونگا تو ڈاکٹر صاحب خود لکھکر بھیج دینگے جو میں نہیں چاہتا تھا۔ بہرحال آپ کی مدد سے کام ختم ہوا اور پی.ایچ.ڈی کی ڈگری بھی مل گئی۔ مقالے کو ہندوستان میں شائع کرنے کے اسباب نہ تھے۔

پاکستان میں چھپوانا خطرے سے خالی نہیں تھا اس لیے کہ میں سرکاری ملازم تھا۔ جب میں سنہ ۱۹۷۰ء میں نوکری سے سبکدوش ہوا تو ڈاکٹر صاحب نے اسے اردو اکیڈمی سندھ سے چھپوادیا۔ میں نے جب اسے چھپی ہوئی شکل میں دیکھا تو پڑھ کر نہایت افسوس ہوا۔ اس لیے نہیں کہ چھپائی میں کوئی خامی تھی بلکہ اس لیے کہ اس میں ڈاکٹر صاحب کا دور سے بھی ذکر نہ تھا۔ یہ کیونکر ہوا اور کیسے ہوا؟ میری سمجھ میں نہ آیا، اس لیے کہ کتاب آپ کی نگرانی میں چھپی تھی۔ اس کی تلافی فقط اس طرح ہوسکتی تھی کہ میں اسے ہندوستان میں چھپوا کر اس کمی کو پورا کروں۔ ایسی بے نفسی، ایسی للّٰہیت ایسا خلوص اور تواضع کرامت نہیں تو اور کیا ہے؟

کئی سال گزر گئے اور ڈاکٹر صاحب سے ملاقات نہ ہوئی۔ آخر جولائی سنہ ۱۹۷۶ء میں آپ کا گرامی نامہ موصول ہوا کہ پیر و مرشد حضرت زوار حسین صاحب رح کے ساتھ ناگپور تشریف لا رہے ہیں۔ یہاں سب چشم براہ تھے کہ کسی روز اچانک سیونی سے مقبول صاحب کے ساتھ غریب خانے پر پہنچ گئے۔ ہم آگے بڑھے تو ڈاکٹر صاحب موٹر میں سے اترے اور اس عاجز سے معانقہ کیا، دل سینے میں ہل گیا اور ایک عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ پھر دیکھا تو ایک فرشتہ خصال نورانی صورت بزرگ نمودار ہوئے، وضع قطع باوقار، شخصیت میں لطافت آمیز جاذبیت، کشش ایسی کہ گویا مقناطیس اپنی طرف کھینچتا ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے آہستہ سے فرمایا "حضرت صاحب پیر و مرشد"۔ میں بے اختیار آگے بڑھا، جھکنے کو جی چاہا مگر جانتا تھا کہ یہ انداز منظور خاطر نہ ہوگا اس لیے کہ یہیں شاید ظاہر بیں نظر کو سجدے کا دھوکا ہوا ہے۔ حضرت نے گلے سے لگایا

تو عجیب کیفیت طاری ہوئی۔ ڈاکٹر صاحب کا قیام تین روز رہا ناگپور کی مخلوق ٹوٹ پڑی، اطراف سے بھی بہت لوگ آگئے تھے۔

ناگپور دو چیزوں کے لیے مشہور ہے۔ ایک سنگترے، دوسرے حضرت بابا تاج‌الدین رحم جن کی کرامتیں مشہور ہیں۔ دوسرے دن ڈاکٹر صاحب نے تاج‌آباد تشریف لے جانے کی خواہش ظاہر کی، سواری کا انتظام ہوا اور ہم تاج آباد پہنچ گئے۔ ڈاکٹر صاحب نے وہاں مراقبہ فرمایا۔ جب فارغ ہوئے تو واپسی میں میں نے دریافت کی " آپ نے وہاں کیا دیکھا؟" مسکرا کر فرمایا " فقط دیکھ لینا ہی بزرگی کی دلیل نہیں ہے۔ ڈاکٹر صاحب نے تھوڑی دیر توقف کیا، پھر میری طرف دیکھکر فرمایا۔ کشف ایسی صلاحیت ہے جس کے اعتبار کو یقین کا درجہ نہ دینا ہی بہتر ہے۔

ایمان کیا ہے ؟ — اسلام کیا ہے ؟ — اس کی ماہیت کے لیے ہم کتابوں کی ورق گردانی کرتے ہیں اور شریعت کے فیصلے پر کاربند ہوجاتے ہیں۔ ایسا ہونا بھی چاہیے۔ اسی پر سارا نظام اسلام قائم ہے۔ مگر ہمارے اسلام اور ہمارے بزرگوں کے اسلام کے درمیان بڑا فرق ہے۔ ان کے دل میں بات پہلے اترتی تھی جس کا نام ایمان ہے؛ پھر اس کا ظہور ان کے اعمال میں ہوتا تھا، جس کا نام اسلام ہے۔ مگر ہمارا حال یہ ہے کہ بات دل میں نہیں اترتی اگرچہ کہ ہمارے ظاہر میں اسلام کی نمائش خوب ہوتی ہے۔ اسی باطن کی اصلاح کا نام طریقت ہے۔ چنانچہ یہ عاجز بھی آج سے تقریباً پچاس برس پہلے حیدرآباد دکن میں حضرت پیرو مرشد مولانا قطب‌الدین رحم کے دست مبارک پر بیعت کرکے سلسلۂ چشتیہ میں داخل ہوا تھا۔ جوانی کا عالم تھا اور آگے بڑھنے کا شوق، شیخ کی قوی توجہ نے کہاں سے کہاں پہنچا دیا

اور جب اڑنے کے لیے پر و بال نکلنے کا وقت آگیا تو شریعت نے کہا خبردار پہلے تصور شیخ کی حقیقت کو سمجھ لینا چاہیے۔ میں تذبذب میں پڑ گیا اور حضرت شیخ نے توجہ ہٹالی۔ میں سمجھ گیا کہ طریقت کی راہ میں ہزاروں خطرات ہیں۔ انسان اندھا بن کر ہی چل سکتا ہے۔ آنکھیں کھولنا خطرناک ہے۔ ع "بہ مے سجادہ رنگیں کن گرت پیر مغاں گوید" کا شاید یہی مطلب ہے۔ میں طریقت کو چھوڑ کر شریعت کے راستے پر آگیا۔ اب جو ہمارے محترم ڈاکٹر صاحب اور حضرت قبلہ پیر و مرشد نے غریب خانے کو اپنے قیام سے شرف بخشا تو دل کے گوشے سے کسی نے آواز دی 'اے سونے والے' تجھے بھی اپنا سبق دھرا لینا چاہیے، یہ دولت گھر بیٹھے تیرے پاس آئی ہے۔ چنانچہ میں نے ڈاکٹر صاحب سے عرض کیا "میرے محترم میں تقریبا بارہ برس سے رجعت میں ہوں، میں بھی اپنا سبق دھرالوں اور تجدید ایمان کرلوں"۔ ڈاکٹر صاحب نے حضرت پیرو مرشد کی طرف رجوع ہونے کے لیے فرمایا اور یہ عاجز بھی سلسلۂ نقشبندیہ میں داخل ہوگیا اور اللہ کا لاکھ لاکھ شکر بجا لایا۔

خالق کائنات نے اپنی نعمتوں کی تقسیم میں کسی کو کچھ دیا، کسی کو کچھ دیا۔ بہت کم ایسے ہیں جن کو ایک ساتھ سب کچھ یا بہت کچھ مل گیا۔ کبھی دین ملا تو دنیا نہیں ملی اور دنیا ملی تو دین سے محرومی رہی۔ تقویٰ ملا تو علم کی کمی رہی اور علم ملا تو تقویٰ نصیب نہ ہوا۔ ایک پھول کو ایک ہی خوشبو دی گئی ہے، علیٰ ہذا القیاس۔ مگر ڈاکٹر صاحب کو اتنا دیا کہ بہت کم کو نصیب ہوا۔ ان کی خوبیوں میں صبر و شکر، زہد و تقویٰ، رافت و رحمت، جود و سخا، راست گوئی،

نیک دلی، تواضع، سخت کوشی وغیرہ ایسی صفات ہیں جن سے ان کے مزاج کا خمیر تیار ہوا ہے اور یہی مزاج ان کے ہر کام میں کار فرما ہے۔ خشوع و خضوع اس غضب کا ہے کہ اسی مناسبت سے دل سینے میں تڑپتا ہے۔ اللہ کے انھی بندوں کے لیے لِمَنْ خَافَ مَقَامَ رَبِّهٖ جَنَّتَانِ کی بشارت ہے۔ خط ایسا پاکیزہ، حسین اور جمیل گویا خطاطی کا ایک نادر نمونہ ہے؛ موتی کی لڑیاں ہیں کہ سطور کی شکل میں کاغذ پر پھیلی ہوئی ہیں، نظریں ٹھٹک کر مضمون پڑھنے سے پہلے ہی مسحور ہو جاتی ہیں۔ ڈاکٹر صاحب اپنی شخصیت کی اس رنگا رنگی میں بیک وقت ادیب بھی ہیں، خطیب بھی ہیں، عالم دین بھی ہیں، محقق بھی ہیں، نقاد بھی ہیں، مؤرخ بھی ہیں، شاعر بھی ہیں، اہلِ دل صوفی بھی ہیں اور حسنِ صفات میں کیا نہیں ہیں؟ مگر ان سب پر ان کا مزاج غالب ہے، اور وہ ساری صفات جن سے ان کے مزاج کی ترکیب ہوئی ہے ان کی ہر سرگرمی میں جاری و ساری ہیں، اسی لیے ڈاکٹر صاحب کے علمی ادبی اور تحقیقی کام کا انداز، یہاں تک کہ ان کی زندگی کا رکھ رکھاؤ، اپنے اندر ایک امتیازی شان رکھتا ہے۔ ایسی جامع اور متنوع شخصیت نہ صرف علم و ادب کو بلکہ اسلامی معاشرے کو کم ہی ملی ہے۔

بے محل نہ ہوگا اگر عرض کروں کہ علی گڑھ میں کسی دن پروفیسر خلیق احمد نظامی صدر شعبہ تاریخ مسلم یونیورسٹی علی گڑھ کے مکان پر مولانا بدرالدین رحمہ کی کتاب حضرات القدس کا ذکر آ گیا۔ میں نے عرض کیا اس کا ترجمہ میرے بزرگ اور کرم فرما پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب نے اردو میں کیا ہے۔

یہ سن کر نظامی صاحب کی زبان سے یہ کلمات بے ساختہ نکل پڑے "That historian" (وہ مورخ؟) ایک لمحے کے لیے میں چونک گیا۔ پھر مجھے اطمینان ہوا کہ یہ کلمات میں نے ایک نامی گرامی مؤرخ کی زبانی بھی سن لیے۔ اس تقریب میں اور نظامی صاحب کے اشتیاق کو دیکھتے ہوئے میں نے ڈاکٹر صاحب کا عطا کردہ 'حضرات القدس' کا نسخہ پروفیسر نظامی صاحب کی نذر کردیا۔ علامہ اقبال کی شاعری اور ان کے افکار پر کئی کتابیں لکھی گئیں۔ ڈاکٹر صاحب نے بھی لکھیں۔ مگر یہاں بھی ان کا اپنا انداز ہے جس میں امتیازی شان پائی جاتی ہے۔

علامہ اقبال کی شاعری کیا ہے؟۔ تجدید و احیاء دین کی دعوت ہے۔ جسے ہم فکرِ اقبال سے تعبیر کرتے ہیں اس کا دوسرا نام فکرِ قرآن ہے۔ اگر ہم علامہ کو کسی درجے میں مجدد کا درجہ دینا چاہیں تو ہمیں یہ تسلیم کرنا ہوگا کہ تجدید و احیاء دین کے جتنے بھی کارنامے آج تک تاریخ میں درج ہیں ان میں اقبال پہلے مجدد ہیں جنھوں نے اپنے افکار کے اظہار کے لیے نثر کے بجائے نظم کی زبان اختیار کی، اگرچہ اس خصوص میں ان کے نثری کارنامے بھی ہیں۔ اقبال اپنی شاعری میں دماغ سے زیادہ دل کی بیداری پر زور دیتے ہیں:

دلِ بیدار فاروقی، دلِ بیدار کرّاری
مسِ آدم کے حق میں کیمیا ہے دل کی بیداری

رسول اللہ صلی اللہ علیہ وسلم سے ان کا عشق اسی بنا پر ہے کہ آپ خلق قرآن کے مظہر ہیں جس کی بنا پر ام المومنین حضرت عائشہ رضی اللہ تعالیٰ عنہا نے فرمایا تھا "خلقہ القرآن" اور مولانا جامی رح بھی فرمایا تھا:

ع ہمہ قرآن در شان محمد ص۔

قرآن مجید کے کئی بطون ہیں اور ان بطون تک فہم انسانی کی رسائی اپنے اپنے درجات کے لحاظ سے ہے۔ اس طرح اقبال کی شاعری کے بھی کئی بطون ہیں۔ اگر ان کی شاعری کے ایک بطن تک فہم کی رسائی ہو بھی جائے تو ضروری نہیں ہے کہ دیگر بطون بھی ہمارے احاطہ ادراک میں آ گئے۔ خلاصہ یہ کہ اقبال کے کلام کو وہی علمی اور ادبی حضرات کماحقہ سمجھنے کے اہل ہیں جن کی علمی بصیرت کی سوتیں اقبال کے فکر و فن سے ملتی ہیں۔ خصوصاً "اقبال اور قرآن" ایسا موضوع ہے جس پر قلم اٹھانے کا حق فقط ان علمائے علم و ادب کو پہنچتا ہے جو قرآن و حدیث اور دیگر علوم اسلامیہ میں گہری نظر رکھتے ہوں۔

ڈاکٹر صاحب کی معرکۃ الآراء کتاب "اقبال اور قرآن" جسے ہم شعری ادب کی تشریحی تنقید کی صورت میں دیکھ رہے ہیں ایسا عظیم علمی کارنامہ ہے جسکی انجام دہی میں فکر و حکمت کے ساتھ ذکر کی کیفیت بھی شامل ہے۔ اگر کلام اقبال ایک بندے کی فکری سطح پر اس کے رب کے کلام کی منظوم تشریح و تعبیر ہے تو اس میں اس کے ناقد کا فکر و تدبر خود ایک عبادت ہے۔ ہمارے ارباب تحقیق و تنقید میں ایسی شخصیتیں کم ملیں گی جن کے ذہن میں کلام الٰہی اور کلام اقبال کے مطالب بیک جا واضح اور حاضر ہوں اور جن کا حافظہ بآسانی علامہ اقبال کے کلام سے متعلق آیات قرآن کی نشاندھی کر سکتا ہو، پھر تقابلی مطالعے میں صحیح فیصلے کی صلاحیت بھی رکھتا ہو — اور اگر اس موضوع پر لکھنے والے کے افکار اور اعمال میں قرآنی احکام بھی جاری ہوں یعنی اس کی سیرت کسی درجے میں قرآنی اخلاق کا نمونہ ہو تو

اس کے لیے مزید شرف ہے۔ یہی وجہ ہے کہ ڈاکٹر صاحب کی کتاب 'اقبال اور قرآن' میں ان کی شخصیت جس درجہ ابھر کر سامنے آتی ہے وہ بات ان کی دیگر تصانیف میں نہیں ملتی، اگرچہ کہ ڈاکٹر صاحب کے سارے موضوعات کسی نہ کسی طور پر ان کی شخصیت کی ترجمانی کرتے ہیں۔ لہذا اگر کہا جائے کہ اس موضوع پر ایسی جامع کتاب نہیں لکھی گئی تو اس کا مطلب یا تو یہ ہوگا کہ اس دور کے علمائے ادب میں اس موضوع پر لکھنے والی کوئی اور ایسی جامع اور متنوع شخصیت پیدا نہیں ہوئی، یا یہ کہ اس دور کی ایسی جامع شخصیت نے اس موضوع پر قلم نہیں اٹھایا۔

'اقبال اور قرآن' پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب کا ایسا نادر علمی اور ادبی کارنامہ ہے جو نہ صرف شاعر کی شخصیت کو اس کی نئی عظمت کے ساتھ جلوہ گر کرتا ہے بلکہ اس کے مصنف کی شخصیت بھی اس طور پر اپنی انفرادی علمی اور ادبی بلندیوں پر نظر آتی ہے۔

پرانی صحبتوں کے نقشے اکثر نظروں کے سامنے آجاتے ہیں اور یادوں کی دنیا آباد ہوکر پھر نظروں سے غائب ہو جاتی ہے۔ اسی عالم خیال میں ڈاکٹر صاحب کے تعلق سے دیکھتا ہوں کہ کبھی وہ طالب علم تھے اور آج استاذ الاساتذہ ہیں، کبھی وہ تحقیق اور تنقید کے میدان میں نئے نئے وارد ہوئے تھے۔ آج اس اقلیم کے بادشاہ ہیں اور سیکڑوں فاضلانہ مضامین اور کتابوں کے مصنف ہیں، کبھی وہ علم و حکمت کی راہ میں شوق کی منزلیں طے کر رہے تھے، آج معرفت کے چمن میں داخل ہیں۔ گویا اس وقت کی صبح

کا طلوع ہونے والا آفتاب آج نصف النہار میں آب و تاب سے چمک رہا ہے۔

وہ محفلیں جو کبھی زندہ تھیں، یادوں میں تبدیل ہوگئیں اور وہ یادیں جو کبھی تازہ تھیں، ماضی کی داستانیں بنکر رہ گئیں۔ اب تھوڑا سا وقت اور باقی ہے، اس کے بعد یہ داستانیں بھی دفتر پارینہ بنکر نسیا منسیا ہوجائیں گی۔ کون کس کو یاد رکھتا ہے اور یاد رکھنا بھی چاہے تو زندگی کی تگ ودو کس کو اس کی فرصت دیتی ہے؟ — انسان کی زندگی روز آفرینش سے یہی رہی ہے — زندگی کا خلاصہ یہی ہے اور یہی اس کی مختصر تاریخ بھی۔

ہاں اس عالمِ رنگ و بو میں ایسے حالات اور واقعات بھی اکثر رونما ہوتے ہیں جن کو دوامی بقا حاصل ہو جاتی ہے۔ یہ وہ حالات ہیں جن کا رشتہ حقائقِ ابدی سے ہے اور جن کا تعلق اس عالمِ لاہوت سے ہے جس کو فنا نہیں، اس معنیٰ میں کہ وہ ہمارے اس عالم سے جدا ہے۔ چنانچہ ہمارے اس دور کے جانِ شریعت و طریقت، رفیع المرتبت پروفیسر ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خاں صاحب مدظلہ العالی کی شخصیت کا شمار ان اصحاب علم و فضل اور اہل دل حضرات میں ہوتا ہے جن کے دل و دماغ کی روشنی میں کتنے بھٹکے ہوؤں نے راہ پائی ہے اور جن کی ہدایت اور رہنمائی نے کتنوں کے درجات بلند کیے ہیں۔ حضرت مکرم کے یہ حالات جن کو شخصیت کی صفات کا ظہور کہیے اسوۂ حسنہ بنکر ہمیشہ مشعلِ راہ رہیں گے جو زبان حال سے یہی کہہ رہے ہیں:

ثبت است بر جریدۂ عالم دوامِ ما

مشاهیر کے خطوط

(بنام ڈاکٹر غلام مصطفیٰ خان)

- نواب صدر یارجنگ مولانا حبیب الرحمٰن خاں شروانی رحم م ۱۹۵۰ء
- علامہ سید سلیمان ندوی رحم م ۱۹۵۳ء
- استاذ الہند قاری ضیاء الدین احمد الہ آبادی رحم م ۱۹۵۲ء
- ڈاکٹر مولوی محمد شفیع مرحوم م ۱۹۶۳ء
- حافظ محمود شیرانی مرحوم م ۱۹۴۶ء
- پروفیسر ضیاء احمد بدایونی مرحوم م ۱۹۷۳ء
- ڈاکٹر عبدالستار صدیقی مرحوم م ۱۹۶۹ء
- ڈاکٹر مولوی عبدالحق مرحوم م ۱۹۶۱ء
- مولانا احسن مارہروی مرحوم م ۱۹۴۰ء
- مولانا سید مطیع اللہ راشد برہانپوری مرحوم م ۱۹۶۰ء
- ڈاکٹر پیر محمد حسن مدّ ظلّہ۔ ماشاءاللہ اب وہ ۸۷ سال کے قریب ہیں۔
- ڈاکٹر مختارالدین احمد مدّ مجدہ۔

[illegible] [illegible]

- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
- [illegible]
  [illegible]
- [illegible]